ذوقِ ادب اور شعور

از

سید احتشام حسین

صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

ناشر

اِدارۂ فروغِ اُردو

۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ

مُبارک بُک ڈپو

بندر روڈ مقابل ڈینسو ہال کراچی ۲

قیمت تین روپے پچاس پیسے

بار دوم سنہ ۱۹۶۳ء

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

آلِ احمد سرورؔ کے نام

فہرست مضامین

۱۔ میں کیوں لکھتا ہوں ۹

۲۔ ادب اور تہذیب ۲۳

۳۔ اُردو ناول اور سماجی شعور ۳۲

۴۔ اُردو تنقید کا ارتقاء (۱) ۴۹

۵۔ ادب میں جنسی جذبہ ۷۱

۶۔ مشاعرے کی افادیت ۸۰

۷۔ ہندوستانی ادبیات اور مسلمان ۹۳

۸۔ ادب کا ماؤی تصور ۱۰۳

۹۔ قطب مشتری کی لسانی خصوصیات ۱۱۴

۱۰۔ غالب کے غیر مطبوعہ خط ۱۳۸

۱۱۔ نظیر اکبر آبادی ۱۴۲

۱۲۔ زبان اور رسم خط ۱۵۹

۱۳۔ پاکستان میں اردو ۱۶۹

۱۴۔ علی گڈھ تحریک کے اساسی پہلو ۱۸۰

۱۵۔ جوش ملیح آبادی۔ شخصیت کے چند نقوش ۲۱۸

۱۶۔ اُردو تنقید کا ارتقاء (۲) ۲۳۹

دیباچہ، طبع دوم

خیال تھا کہ جب ذوق ادب اور شعور کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو اس کی افادیت بڑھانے کے لیے کچھ مضامین کا اضافہ کروں گا لیکن اب جو اس کی نوبت آئی تو محسوس ہوا کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اس کا حجم بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہوا کہ ابھی حال ہی میں میرے ادبی اور تنقیدی مضامین کے تین مجموعے (عکس اور آئینے افکار و مسائل اور اعتبار نظر) مرتب ہوئے ہیں۔ اکثر اہم اور قابل توجہ مضامین ان میں شامل کر لیے گئے ہیں، محض ترمیم اور اضافہ کے لیے اس مجموعہ میں نئے مضامین شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے! بہرحال اس وقت یہ مجموعہ اپنی پہلی ہی شکل میں شائع ہو رہا ہے اتفاق دیکھئے کہ یہ دوسری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی کہ مضامین پر نظر ثانی کر لوں اور زیادہ نہیں تو ان لفظی اور معنوی اسقام ہی کی تصحیح کر دوں جو میری یا کتابت کی بے توجہی کی وجہ سے ان میں جگہ پا گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہوا کیونکہ اس کی کتابت اور طباعت ایسے وقت میں ہوئی جب مجھے دوسرے کاموں کی وجہ سے کاپیاں وغیرہ پڑھنے کی فرصت نہ تھی۔ فرصت کے انتظار میں تاخیر ناشر کے لیے تکلیف دہ تھی اس لیے مجبوراً اس سے بھی درگذر کرنا پڑا۔ اب اگر کچھ غلطیاں تلافی درست ہو گئی ہوں گی تو یقیناً کچھ بڑھ بھی گئی ہوں گی، ان سے کسی حالت

میں مفر نہیں ہے۔

آج جب چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے اور ہندوستانی ذہن جنگ اور امن مصلحت اور عقیدہ، وقتی مفاد اور بنیادی نصب العین کو واضح کرنے کی کشمکش میں مبتلا ہے مجھے اپنے اس ادبی عقیدے کی صداقت پر اور زیادہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ حساس ادیب قومی بحران اور انسانی کشمکش سے بے خبر نہیں رہ سکتے اور وہ لوگ بھی جو "خالص ادب" کے قائل ہیں کسی نہ کسی حیثیت سے اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اردو زبان ادب نے ایک دفعہ پھر قومی زندگی کی تعمیر اور قومی روح کے اظہار میں دوسری زبانوں سے بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ زندگی کے انھیں عارضی ہیجانات کا صحیح ذہنی اور جذباتی احساس، آفاقی اور ابدی احساسات کے اظہار کا پیش خیمہ اور ذریعہ بنتا ہے، بس فن کا صحیح تصور اور آلۂ اظہار یعنی زبان پر قدرت ہونا چاہیے۔ یہ تنقیدی نقطۂ نظر فلسفیانہ، تاریخی، ادبی اور جمالیاتی نقطہ ہائے نظر سے ادب فہمی میں سب سے زیادہ معین ہوتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تصورات زندگی کے وہ مریضانہ پہلو بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ خالص ادب کے پردہ کار جن پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ چینی یا کسی دوسرے قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اس حقیقت کا صحیح احساس بہت ضروری ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین کی تہہ میں یہی تصور نقد پوشیدہ ہے۔ اس لیے ان کی دوبارہ اشاعت کچھ لوگوں کے لیے ضرور تسکین کا سامان فراہم کرے گی مجھے خوشی ہے کہ محبی شمس صاحب نے اس کے دوسرے اڈیشن کا بھی انتظام کیا ہے۔

الہ آباد
۱۰ مارچ ۱۹۶۳ء

سید احتشام حسین

دیباچہ

میرے تنقیدی اور ادبی مضامین کا پانچواں مجموعہ ذوقِ ادب اور شعور آپ کے پیشِ نظر ہے۔ چند الفاظ عنوان کتاب کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ نام تنقید کے ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کرتا ہے جس پر ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت تھی لیکن جو اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جا سکا۔ میرا خیال ہے کہ تنقید کتنی ہی انفرادی اور تاثراتی کیوں نہ ہو تربیت ذوق میں ضرور معین ہوتی ہے، اس سے محض تاثر کی ترسیل نہیں ہوتی پڑھنے والے کے علم اور شعور میں بھی اضافہ ہوتا ہے، یہ بات نہایت خاموشی سے بتدریج بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور علمی انداز میں دلائل و براہین کو ٹکرا کر بھی نتیجہ دونوں صورتوں میں یہی ہوتا ہے کہ تنقید نگار جارحانہ طور پر اپنا نقطہ نظر مسلط کیے بغیر ادب اور اس کا مطالعہ کرنے والوں کے درمیان ایک کڑی بنجاتا ہے۔ اس لیے تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں سے بحث ادب کی ایک اہم خدمت بھی ہے اور ادب کا ایک ناگزیر جزو بھی۔ جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں یہ فرض انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا تو انھیں شائع ہی نہ کیا جاتا۔

بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسے مختصر مضامین تنقید پر مبسوط تصانیف کا بدل نہیں قرار دیئے جا سکتے، یہ تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کی تشنگی کو بڑھاتے ہیں یہ اُن موضوعات کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں جن کی جھلک یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ موضوع زیر بحث کے تمام پہلوؤں یا کسی ایک پہلو کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ بہت سے اہم مسائل نقد کے لیے اشاریہ کا کام دیتے ہیں اور بہت سے ایسے گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں جن پر نظر رکھنا ضروری ہے یہی جواز ہے انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینے اور شائع کرنے کا۔

جو مضامین مجموعہ میں شامل ہیں وہ اپنی اہمیت آپ ظاہر کریں گے لیکن قبل اس کے کہ آپ ان کا مطالعہ کریں چند مضامین کے متعلق دو چار لفظ عرض کر دینا چاہتا ہوں "پہلا مضمون" میں کیوں لکھتا ہوں؟ "ادبی تخلیق اور تنقید" کے متعلق میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ باتیں میں اپنے انداز میں پندرہ سولہ سال سے کہتا چلا آرہا ہوں اور میری طرح کئی اور نقادوں نے انھیں عام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اعادہ ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے۔ چند انگریزی یا فرانسیسی مصنفوں کے نام محض مرعوب کرنے کے لیے نہیں لیے گئے ہیں بلکہ اس طرح موضوع کی اہمیت اور اس کے متعلق بعض اہم ادیبوں کے ردِ عمل کا اظہار کر کے اپنے نقطۂ نظر کا جائزہ لینا مقصود تھا ورنہ یہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کا نام لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ "ادب کا مادی تصور" بھی اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں ایک علمی نظریۂ ادب کی وضاحت اس سے ہوتی ہے۔ "اردو تنقید کا ارتقاء" دو حصوں میں ہے، ایک ہی مضمون ہو سکتا تھا لیکن دونوں مختلف موقعوں پر وقفوں کے بعد لکھے گئے اس لیے انھیں الگ ہی الگ رکھا گیا ہے۔ "علی گڈھ تحریک کے اساسی پہلو" میں تاریخ کے ایک نہایت ہی پیچیدہ مقام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "غالب کے غیر مطبوعہ خط" ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح میرے ہاتھ آئے تھے۔ جی چاہا کہ انھیں اس کتاب کے ایک گوشہ میں محفوظ کر دوں۔

ان مضامین کو یکجا کر کے کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا خیال اس وقت مجھے نہ پیدا ہوتا اگر محمد حسین صاحب شمس مالک "دربار" ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کا خلوص اصرار شامل حال نہ ہوتا۔ چند مہینوں کے اندر اس ادارہ نے اردو ادب کی جیسی قیمتی اشاعت کی ہے وہ کسی ادارے کے لیے باعث رشک ہو سکتی ہے انھیں کے اصرار پر یہ مجموعہ پیش ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی
۲۰ مارچ ۱۹۵۵ء

سید احتشام حسین

نظیر اکبر آبادی

آج کا آگرہ نہیں، اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع
کا اکبر آباد، صدیوں سے خاص تہذیبی مرکز رہ چکا تھا جسے مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے
میں غیر معمولی تمدنی اور تہذیبی عروج حاصل ہوا۔ اس سے کچھ دن پہلے ہی ویشنوی تحریک
کے کرشن پرست طبقہ نے ولبھ اچاریہ کی سرکردگی میں بندرابن، متھرا اور آگرہ کے
علاقہ کو روشن بنا دیا تھا، برج کا یہ علاقہ اپنی مقامی بولی برج بھاشا کی رنگینی
لطافت، شعریت، غنائی حسن، جاذبیت اور عوامی اسلوب بیان کی تازگی لے کر
یکایک شمالی ہندستان پر چھا گیا اور تھوڑی ہی مدت میں ولبھ اچاریہ کے آٹھ شاگرد
اور اَن گنت ماننے والوں نے برج بھاشا کو ملک کے گوشے گوشے میں پہونچا دیا
سورداس کے پد، اور میرابائی کے بھجن اسی سرزمین میں پیدا ہوئے، سیکری
اور سکندرہ کی عمارتیں، تاج محل، موتی مسجد اور قلعہ اسی علاقہ میں وجود میں آئے
موسیقی کے ماہروں نے یہیں اُن راگوں کو جنم دیا جو عوام کے دلوں کی دھڑکن
بن گئے اسی طرح برج کے اُس خطہ کو وہ تہذیبی روایتیں جمع کرنے کا موقع ملا
جو جاگیردارانہ سانچے میں تشکیل پانے کے باوجود عوام کے ذوق حیات کی ترجمان

کرتی ہیں کیونکہ عوام مختلف قدیم نظامہائے معاشرت میں دبے اور کچلے ہوئے
نے کے باوجود زندگی کی تکالیف کو برداشت کرنے کے لئے گیتوں، مذہبی اور
تیوہاروں، مثالی قصّوں اور بھدّی تفریحوں میں ایسے تہذیبی پہلو ڈھونڈھ نکالتے
جو ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی امنگوں اور خوابوں
ی پتہ دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مخصوص قسم کے جاگیردارانہ نظام
جو صدیوں رائج رہا، تہذیب میں وہ یک رنگی پیدا نہ ہوسکی جو پوری طرح یہاں
زندگی کی ترجمانی کرتی تاہم تاریخی تجزیہ اور زندگی کی معاشی بنیادوں کے
عہ سے ادب اُردو، اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں مختلف اثرات ضرور تلاش
جاسکتے ہیں۔

سترھویں صدی تک جاگیردارانہ نظام اپنی حدوں کے اندر ترقی کرتا رہا
ن صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں کو عروج حاصل ہوتا رہا۔ دیہی پیشہ ور نسبتاً
لمون زندگی بسر کرتے رہے، طاقتور حکمرانوں کے نیچے کھیتی کرنے والے معمولی معمولی
لیوں کے باوجود ایک ہی طرح کی خاموش زندگی گزارتے رہے۔ پیداوار کا زرعی
ام جس پر معاشی زندگی کا انحصار تھا، جمود کی منزل میں تھا، اگر کچھ تبدیلیاں ہوتی
یں تو بادشاہوں اور امیروں کے یہاں، عام لوگوں کے یہاں ان کا اظہار
ے ہلکے مذہبی اور اخلاقی رجحانات میں دیکھا جاسکتا ہے لیکن اٹھارھویں صدی کے
ط سے نئی یورپی طاقتوں کی دخل اندازی اور استحصال کی وجہ سے ملک کے
ں علاقوں میں صورت حال بدل رہی تھی جو اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے
ی ہند پر بھی اثر انداز ہوئی۔ جاگیرداری نظام کی کمزوری اور کسی دوسرے

نظام کی عدم موجودگی نے ایک نراج کی سی صورت پیدا کر رکھی تھی، یہاں کی صنع
تجارت اور زراعت سب آہستہ آہستہ تباہی کے غار میں گر رہی تھیں اور و
معاشی دیہی نظام تتر بتر ہو رہا تھا جس نے صدیوں سے عوام کو مختلف پیشوں ا
طبقوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا، بادشاہتوں کی تبدیلیاں، فوجی مہم آزماؤں،
معرکہ آرائیاں اکثر اس نظام کو توڑ دیتی تھیں لیکن وہ پھر ایک ہو جاتے تھے اور گاؤ
کے مختلف پیشہ ور اور کسان مل جل کر پھر ایک پنچایتی خود کفالتی زندگی کا ڈھانچہ
کھڑا کر دیتے تھے، اب جو اہم انقلابی تبدیلیاں ہوئی تھیں عوام اس کے دور رس
نتائج سے بے خبر تھے، اور پچھلے ہی دنوں کی طرح قدیم روایات کو سینے سے چمٹائے ہو
تھے، انھوں نے بادشاہوں اور امیروں کی عزت کرنا سیکھا تھا اور گو ان کی حالت
ہوتی جا رہی تھی لیکن ان کی یہ روایتیں چلی جا رہی تھیں۔ ہندوستان کی دولت انگلت
پہونچ کر وہاں صنعتی انقلاب کا سبب بن رہی تھی اور ہندوستان اپنے خیال میں
صرف اپنی تقدیر کا تماشہ دیکھ رہا تھا بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہر جگہ لوگ ا
تبدیلیوں سے بے خبر قدیم روایتوں کے سہارے جی رہے تھے چنانچہ ہندوستا
کے وہ شاعر اور فن کار بھی زندگی کے اس بہاؤ سے بے خبر تھے جن کی رسائی ا
عوام کے دلوں تک تھی۔

نظیر اکبر آبادی اٹھارھویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے، ساری عمر آگرہ
اور اُس کے گرد و نواح میں رہے اور ایک پیشہ ور معلم کی زندگی بسر کی۔ آگرہ ہی میں
۱۸۳۰ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی زندگی میں آگرہ کو، وہاں کے پیشہ وروں کو
وہاں کے امیروں، غریبوں کو، ہندوؤں مسلمانوں کو، وہاں کے تربوز، ککڑی اور

ے برتنوں کو، مختصر یہ کہ وہاں کے ذرّے ذرّے کو ایک خاص جگہ حاصل ہے۔
ہ اپنی روایتوں کے لحاظ سے کرشن کنہیا، اکبر، شاہجہاں اور سورداس کا آگرہ
معاشی حیثیت سے وہ زوال پذیر شہر ہے جس میں افلاس، بیکاری، بیروزگاری
پیشہ وروں کی بدحالی کا زور ہے، جو ایک طرف تو مغل حکومت کا ایک حصّہ
دوسری طرف برطانوی استحصال کا شکار بن رہا ہے، دوعملی کی اس کیفیت کو
نے اور دیکھنے والی آنکھیں اس وقت موجود نہیں تھیں لیکن ان کے نتیجے میں جو تو
زندگی پر پڑ رہا تھا اور خارجی حالات کی وجہ سے جو داخلیت پیدا ہو رہی تھی
کی پرچھائیاں شعروادب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت کے شعراء کو
یرداری نظام کی چولیں ہل جانے کا اندازہ نہ ہو لیکن وہ اس عام بے دلی کے
ار ضرور تھے جو اس زوال پذیر زمانے میں پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ
ر اکبرآبادی اپنی ساری شاعری میں کہیں واضح طور پر بدلتے ہوئے حالات کی
ی توجیہ پیش نہ کر سکے، حالانکہ اُردو کا کوئی شاعر نظیر سے زیادہ بھدّے پن کی
تک سادہ طریقے پر عوام کے قریب نہیں ہے۔

عوام سے یہی تعلق ہے جس نے نظیر کے مطالعہ کو مشکل بنا دیا ہے، قدیم
اسکی نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے انھیں عام لوگوں میں اس قدر گھلا ملا دیکھ کر
وقتی اور بازاری شاعر کہہ دیا اور نئے نقادوں نے انھیں دورِ جدید کا بانی، واقعیت
رجمہوریت کا علمبردار قرار دے دیا۔ دونوں صورتیں نظیر کی ادبی قیمت کا صحیح اندازہ
انے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ عوام کے قرب ہی کی وجہ سے ایک انھیں
ے گراتا ہے اور دوسرا اُردو شعراء کی صفِ اول میں جگہ دیتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا

چاہیئے کہ نظیر کے عوام کا دائرہ وسیع ہے اس میں مہم طریقے پر ہر طرح کے لوگ شا
ہیں جنھیں اس وقت تک اور نظیر کے بعد بہت دنوں تک شعر و ادب کے ایوان میں
داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی مگر نظیر کی انسان دوست شاعری نے انھیں
بھی اس صف میں بٹھا دیا، جس میں بادشاہ، وزیر، امراء اور مذہبی بزرگ بٹھائے
جاتے تھے، نظیر کے ہاتھوں گویا اردو شاعری کے محل میں ایک چور دروازہ بن گیا
جس کی راہ مقررہ موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات داخل ہو سکتے تھے نظیر
سے قبل بھی دکن میں محمد قلی قطب شاہ نے اور دلی میں فائز نے بعض عام دلچسپی کے
موضوعات پر نظمیں لکھی تھیں لیکن ان کا انداز رومانی اور مقصد شاعری تھا۔ نظیر نے پہلی
دفعہ عوام کو موضوع شعر کا مستحق سمجھا اور ان کی زندگی کو مع اس کی سادگی اور نقائص
کے پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا۔ ان کے عوام جمہوریت پسند اور اپنے حقوق
کے لئے جد و جہد کرنے والے عوام نہیں ہیں بلکہ وہ ہیں جو جاگیرداری کے زوال پذیر
دور میں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، تفریحوں اور غموں کے ساتھ قسمت پر شاکر ہیں جو زندہ
اور متحرک ہیں جنھیں آگے بڑھنے کا راستہ یا اپنی منزل نہیں معلوم، یہ اُس عہد کے شعور
کا نقص تھا۔ ورنہ جو شاعر آٹے دال اور روٹیوں کی مادی اہمیت سے واقف ہے
وہ بے روزگاری، مفلسی اور بھوک کا ذکر کرنے کے بعد ان کے حاصل کرنے کی
جد و جہد کا ذکر نہ کر سکے، یہ بظاہر تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے۔

گو اٹھارویں صدی کی ابتدا میں شمالی ہند کا بڑا حصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے
استحصال کا شکار ہو چکا تھا، لیکن عوام اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے
یہی نہیں بلکہ خود وہ طبقہ جو مٹنے کے قریب تھا اور سات سمندر پار جس کی موت کا

رہا تھا، اس طوفان سے ناواقف تھا جو اُسے ختم کرنے کے لئے اُٹھ رہا
ی قومی طاقتیں جو جاگیرداری کے کمزور ہوتے ہوئے نظام کو سنبھالنے کے لئے
ہی تھیں وہ وقتی طور پر طاقتور نظر آرہی تھیں لیکن ان کے سامنے بھی ترقی کا
نہیں تھا، مرہٹے، سکھ، جاٹ، نظام اور دوسرے عناصر آپس میں دست و
ن بھی تھے اور کسی کسی محاذ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ کرکے اپنے جاگیردارانہ نظام
بھی چاہتے تھے لیکن ذرائع پیداوار پر آہستہ آہستہ دوسروں کا قبضہ ہوتا جارہا
ممکن تھا کہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے اسے روکا جاسکے۔ عام سیاسی پستی،
دی بدحالی، غیر منظم اور غیر ترقی پذیر دیہی معیشت کی وجہ سے مستقبل مایوس کن
ہوتا تھا اور نظیر کی شاعری بھی زندگی کی بے ثباتی اور موت کے پیام سے بھری
ہے۔ اُن کی نگاہ خارجی حقائق پر ہے، تبدیلیوں پر ہے لیکن ان کے اسباب
ائج پر نہیں ہے تاہم ان کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ اس میں سچی حقیقت نگاری
ساتھ ساتھ انسان کی عظمت اور محبت، انصاف اور مساوات کا احساس بھی ہے،
ہ اثباتی پہلو ہے جو نظیر کی شاعری کو محض ایک جماعت کی شاعری بنا کر نہیں
دیتا۔ نظیر کا طبقاتی احساس مکمل طور پر نچلے طبقہ کا احساس نہیں ہے کیونکہ
یں لوٹنے والے طبقوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ نہیں ملتا لیکن عوام کی زندگی
لچسپی، ان کے مسائل پر انھیں کے نقطہ نگاہ سے غور کرنے کی کوشش انھیں
ب و لہجہ میں ان کے دکھ سکھ کا ذکر اور ان سے بے پایاں خلوص کچھ کم قیمتی ادبی ورثہ
ں ہے جو نظیر چھوڑ گئے ہیں۔

جس طرح نظیر کی شاعری کسی مکتب خیال سے باقاعدہ اور روایتی انداز

میں وابستہ نہ تھی۔ اسی طرح وہ خود بھی کسی مخصوص طبقہ سے کلیتاً وابستہ نہیں
اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی طبقہ میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنی ذہنی افق
وسیع ہمدردی اور عام لوگوں کے ساتھ ربط رکھنے کی وجہ سے وہ محض اپنے طبقہ
یعنی متوسط طبقے کے نقطۂ نظر میں محدود نہ تھے بلکہ اپنا شمار پیشہ وروں میں کر کے
ان عناصر کے ترجمان بن گئے تھے جو اس وقت تک شاعری میں جگہ نہ پا سکے
ان کی شاعری میں پیشہ ور اتنی جگہ پاتے ہیں کہ ان کے خیالوں کی بنیاد کا پتہ چل
جاتا ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ان کے یہاں روایتی انداز کی شاعری یا قدیم روا
سے محبت نہیں ملتی لیکن یہ ضرور ایک اہم حقیقت ہے کہ انھوں نے محض در
کی مریضانہ اور محدود فضا کو توڑ دیا اور حقیقت کو جس طرح دیکھا اسی طرح بیا
کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے پاس ادراک حقیقت کا کوئی معروضی فلسفہ نہ تھا
ان کے شعور کی بنیاد کسی علمی اصول پر نہ تھی۔ تاہم ان کی انسان دوستی
ان کی ٹھیک رہنمائی کر رہی تھی۔ ان کی مشہور نظم "شہر آشوب" اس سلسلہ میں
مطالعہ کرنے کی چیز ہے، جو بیکاری، بے روزگاری، تجارتی سرد بازاری اور غیر یقینی
معاشی حالت کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے۔ پوری نظم میں پیشہ وروں کی تباہ حالی
کا ذکر ہے، نہ حکومت کے زوال کا ماتم ہے نہ جاگیرداری کے انحطاط کا غم، لیکن
افلاس گھن کی طرح ایک غیر ترقی پذیر اور جامد سماج کو کھائے جاتا ہے، اس کی بصیرت
ضرور ملتی ہے۔ یوں تو پوری نظم اہم ہے لیکن ۳۶ بند نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے
چند بند اندازہ لگانے کے لئے نقل کئے جاتے ہیں ؎

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی　　کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی

ر و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

گرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
ز و دل سے برے وقت سے پناہ وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

ن، بنئے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
ہیں اُڑتی ہے پڑی خاک بیشمار بیٹھے ہیں یوں دکانوں پہ اپنی دکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سونار کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس ۳۶ پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

بہت سے پیشہ وروں کی بیکاری کا ذکر کرنے کے بعد نظیر لکھتے ہیں ؎

ت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے بیکار کب تلک کوئی قرض و ادھار کھائے
وں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

نہ خادموں کے تئیں مقبروں کے بیچ بامن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
ہیں پڑھنے والے بھی سب مدرسوں کے بیچ حیراں ہیں پیرزادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

ے ہیں آج آگرے ہیں کارخانجات سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات

کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہئے بات ‏ ‏ روزی کے اب درخت کا ملتا نہیں ہے پا

ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ ‏ ‏ ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ

ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ ‏ ‏ وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے

جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خار بند

کیوں یار اس مکان میں کیسی چلی ہوا ‏ ‏ جو مفلسی سے ہوش کسی کے نہیں بجا

جو ہے سو اس ہوا میں ہے دیوانہ ہو رہا ‏ ‏ سودا ہوا مزاج زمانے کو یا خدا

تو ہے حکیم کھول دے اب اس کے چار بند

ہے میری حق سے اب یہ دعا شام اور سحر ‏ ‏ کر آگرے کی خلق پر اب مہر کی نظر

سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر ‏ ‏ اس ٹوٹے شہر پہ بھی الٰہی تو فضل کر

کھل جاویں ایک بار تو سب کاروبار بند

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے ‏ ‏ ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے

مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے ‏ ‏ شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

یہ نظم صرف آگرے کا مرثیہ نہیں اس ہندوستان کا مرثیہ ہے جس کی دولت باہر جا رہی تھی جس کے پیشہ ور بے روزگار ہو رہے تھے، جس کا کاروبار بند ہو رہا تھا اور جس کے وارث کا پتہ نہ تھا کہ کون ہے؟ مغل بادشاہ، چھوٹے چھوٹے امراء اور جاگیردار یا ایسٹ انڈیا کمپنی؟ نظیر کا شعور تاریخ کی منطق سے بے خبر تھا، ان کی حقیقت پسندی اور انسان دوستی ان پر حقائق کا در کھولتی تھی۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے یہاں مثالیت اور تصور پرستی کی بھی جھلک برابر ملتی ہے گو اس میں حب الوطنی اور

نیا کی عام روایتوں کا اثر بھی نمایاں ہوتا ہے اس لئے یہ ٹھیک ٹھیک بتانا
ہے کہ نظیر زندگی سے کیا مطالبہ رکھتے تھے۔ آگرے کے شہر آشوب کے بعد
نظم ہے اس کا عنوان ہے "شہر اکبر آباد کی تعریف میں" اور اس میں رسمی انداز
آگرے کا حسن "غیرت حور و پری" نظر آتا ہے۔ یہ تضاد محض نظریاتی بنیاد نہ ہونے
سے نہیں ہے بلکہ اس کشمکش کی وجہ سے ہے جو حقیقت اور خواہش کے
یان جاری رہتی ہے اور فن کار کو بہتر زندگی کی جستجو پر اکساتی رہتی ہے۔ نظیر کا
بہتر زندگی کا راستہ پانے کا دور نہ تھا، کھونے، الجھنے اور غم کھانے کا دور
جھنجلانے اور گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کا دور تھا، اس لئے نظیر بھی آلام حیات
چھٹکارا پانے کا صرف ایک ہی راستہ دیکھتے تھے اور وہ راستہ موت کا تھا۔
نہیں ہے کہ انھیں زندگی کی لذتوں، مسرتوں اور دلآویزیوں کا احساس
ہے، نہیں، اس کا احساس ہے لیکن اس کے حصول کی صورت سامنے نہیں
نہ کوئی جماعت ہے نہ طبقہ، نہ فرد واحد ہے نہ قوم، جو سب کو اوپر اٹھالے اور
مسرتوں میں سے تھوڑا ہی سا حصہ بخش دے۔ اس لئے موت کا خیال آتا ہے
یہ خیال بے ثباتی دنیا اور بے حقیقتی انسان کے رسمی تصور میں مدغم ہو کر اپنی
دیت کھو دیتا ہے۔ نظیر کی تقریباً ایک درجن اہم نظمیں وہ ہیں جو قدرت کی
ں کو انسان کی ملک بنانے کے بعد موت کے پنجے میں پھنس کر بے بس ہو جانے
دلاتی ہیں۔

نظیر کے سامنے انسان کی وسیع اور بھرپور زندگی تھی، بچپن سے لے کر موت
کی زندگی، اس زندگی کے بہت سے پہلو اور ان کی تفصیلات، مادی ضروریات

اور اخلاقی تصورات، سب ان کے پیش نظر ہیں لیکن ان میں کوئی مخصوص تسلسل
اور ان کے اندر دوڑتی ہوئی کوئی فلسفیانہ صداقت نہیں ہے۔ اس لئے ان کے
کلام میں تضاد ملتا ہے۔ حالانکہ اس تضاد کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نظیر زندگی کے بہاؤ
کو انسانوں کے چھوٹے چھوٹے غم اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے آئینے میں دیکھتے تھے
اس سیلاب سے بے خبر تھے جس سے زندگی کی شکل بنتی بگڑتی ہے، مبہم طور پر نظیر زندگی
کے تغیرات کا احساس رکھتے تھے اور ان کے اسباب سے ناواقف ہونے کی وجہ
سے زیادہ تر متعجب اور متحیر رہتے تھے تاہم عام لوگوں کی طرح وہ بھی بہت جلد زندگی
کی دلچسپیوں میں کود پڑتے تھے اور گرد و پیش کو بھلا کر کچھ لمحوں کے لئے اسی کے ہو
تھے، پیراکی کے میلے، تیوہار، بلبلوں کی لڑائی، ریچھ اور اژدہے کے بچے، پتنگ بازی
جانوروں کی لڑائی، کبوتر بازی۔ ہر چیز میں ان کے لئے لطف ہے کیونکہ غم حیات
سے لڑنے کے لئے ان کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ان سے باہر نکل کر پھر حقائق
کا سامنا ہے جو بہت تکلیف دہ اور دل شکن ہیں۔ اس صورت حال کو محض تضاد
کہنے سے پوری بات واضح نہیں ہو سکتی۔ یہ نظیر کا عام زندگی سے غیر معمولی خلوص تھا
جو انھیں مسرت کی جستجو میں ہر طرف لے جاتا تھا، ان کے وسیع قلب میں سب کے لئے
جگہ تھی۔ مگر عام لوگ ان کے خیالوں کو توانائی بخشتے تھے۔

نظیر کی انسان دوستی اور عوام پرستی ہی وہ چشمہ ہے جس سے انھیں شاعرانہ
قوت اور صداقت کے خزانے ملتے ہیں۔ ایچ پیچ اور فلسفہ و منطق کے بغیر ان کا ذہن
انسانی مساوات کی بنیادی حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے، مصنوعی تہذیب اور
انسانی سماج کی عائد کی ہوئی بلندی اور پستی کی حدوں کو چیر کر نظیر اپنے وسیع

مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر انسانوں کو سمجھ لیتے ہیں اور انھیں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) انسان ہونے کی حیثیت سے سارے انسان برابر ہیں۔

(۲) روٹی، دال اور پیسے کی ضرورت کے اعتبار سے سارے انسان برابر ہیں۔

(۳) موت کے سامنے ایک انسان اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ ان حقائق کو نظیر نے اس طرح دہرایا ہے کہ کسی قسم کے ابہام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ تمام انسانوں کے برابر ہونے پر ان کی مشہور نظم "آدمی نامہ" جس کی سادگی، زور اور خلوص کا جواب اردو یا ہندی شاعری میں مشکل مل سکے گا۔

پوری نظم نقل نہیں ہو سکتی چند بند دیکھئے ؎

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب، غوث، ولی، آدمی ہوئے منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر سے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے اتنی کہ اپنے زور ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ　　پھولوں کی سیج ان پہ چمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ　　سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک پر پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

روٹی انسان کے لئے کتنی ضروری ہے اور اس ضرورت میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں، مگر کچھ کو نصیب ہے اور کچھ فاقہ کر رہے ہیں، نظیر نے کئی نظموں میں اس طرف اشارے کئے ہیں ؎

کیا کہوں یارو میں نقشہ خلق کے احوال کا　　اہل دولت کا چلن یا مفلس و کنگال کا
یہ بیاں تو واقعی ہے ہر کسی کے حال کا　　کیا تونگر، کیا غنی، کیا پیر اور کیا بال کا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

یا :-　　کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اسی طرح موت کے سامنے سارے انسانوں کی برابری نہ جانے کتنی نظموں میں پُر اثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ نظمیں محض صوفیانہ فنا پرستی کی مظہر نہیں ہیں بلکہ انسانوں میں جو عدم مساوات رائج ہے اس کے خلاف احتجاج کی حیثیت بھی رکھتی ہیں ؎

دنیا میں کوئی شاد کوئی دردناک ہے　　یا خوش ہے یا الم کے سبب سینہ چاک ہے
ہر ایک دم سے جان کا ہر دم تپاک ہے　　ناپاک تن پلید نجس یا کہ پاک ہے
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

عمدوں کے تن کو تانبے کے صندوق میں بھرا　　مفلس کا تن پڑا رہا ماٹی اُپر سڑا

یہاں یہ اور نہ ثابت وہ واں رہا دونوں کو خاک کھا گئی یارو کہوں میں کیا

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اس سلسلہ کی سب سے مشہور نظم بنجارہ نامہ ہے جس کے ترنم، طرز ادا اور ت زبان سب نے مل کر اسے لازوال بنا دیا ہے۔

اس طرح نظیر بنیادی طور پر انسان کی مادی مساوات کے قائل ہیں اور ص بھی ایسے خیالات کا حامل ہوگا وہ عوام سے دور نہیں رہ سکتا۔ اس کا نقطۂ نظر قانہ، ہمدردانہ اور مخلصانہ اور اس کا اندازِ بیان عام پسند ہوگا۔ نظیر کی زبان کا لعہ الگ ایک مقالہ کا مستحق ہے پھر بھی اس طرف چند ضروری اشارے کرنا ری ہے، کیونکہ اگر ہم ان کی زبان کی خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو انکی عری کا بہت اہم پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔

زبان اور شاعری کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ اکثر اس کی طرف نگاہ بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر نے زبان کے استعمال میں اپنی شخصیت کا رکیا ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی سماجی اور طبقاتی حیثیت کو نمایاں کر دیا الفاظ، محاورات اور فقرے اپنے استعمال سے استعمال کرنے والے کے سماجی ط کا پتہ دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ شعر و ادب کے مقصد اور نظریۂ فن کا اندازہ بھی انھیں ہوتا ہے۔ نظیر کا تعلق ہر گروہ، ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگوں سے تھا، یہ تعلق محض نہیں تھا، ان کی زندگی اور وجود کا اہم حصہ تھا۔ محض قدرت بیان یا پرگوئی سے وہ مختلف مذاہب کے پیشواؤں، مختلف تہواروں، رسموں، کھیلوں کا نہیں کرتے تھے، ان سے عقیدت رکھتے تھے اور انھیں برتتے بھی تھے، موقع

ملنے پر ان میں شریک بھی ہوتے اور ایک مخلص کی حیثیت سے اس کا اظہار بھی کرتے
تھے۔ اگر کوئی شاعر علمی، فنی اور لسانیاتی طور پر زبان کے ہر پہلو پر قابو پالے تو وہ ہر
طرح کے اظہار خیال میں یک رنگی اور یکسانی دکھائے گا ورنہ ہر موضوع کے ساتھ
انداز بیان بدلتا رہے گا، نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی کچھ اسی قسم کی خامی نظر آتی
ہے۔ اگرچہ وہ بہت حد تک دور ہو گئی ہے۔ وہ زبان جو نظیر نے غزلوں یا بعض نظموں
میں استعمال کی ہے کم و بیش وہی روایتی انداز رکھتی ہے جس کا آخر اٹھارھویں اور
ابتدائی انیسویں صدی میں رواج تھا۔ کہیں کہیں اُن میں ایسے الفاظ آ گئے ہیں
جنھیں ثقہ اور محتاط غزل گو استعمال نہ کرتے۔ اس طرح کی نظمیں زیادہ تر وہی ہیں
جو روایتی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہندو عقیدے سے متعلق
جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں ہندی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہو گئی ہے جیسا کہ فطرتاً ہونا
چاہئے تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ان کی عام بول حال کی زبان نہ ہو گی
اور تیسری قسم کی زبان وہ ہے جو انھوں نے اپنی عام دلچسپی کی اعلیٰ نظموں میں استعمال
کی ہے۔ یہی زبان ان کے مزاج، موضوع، شخصیت اور مقصد سے گہرا تعلق رکھتی
ہے اور انھیں نظموں میں وہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فنی نقطۂ نظر سے نظیر زبان کے استعمال کے معاملہ میں
غیر محتاط ہیں کیونکہ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ ایک
ہی لفظ کو کبھی ایک جگہ بالکل ٹھیک استعمال کرتے ہیں اور دوسری جگہ بے احتیاطی
سے استعمال کر جاتے ہیں یا تلفظ کو ضرورت شعری کے لئے غلط کر دیتے ہیں۔ بعض ایسی
غلطیاں جن کی طرف نقادوں نے توجہ کی ہے، اگر انھیں نظیر کی شاعری اور ان

ید کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ غلطیاں شعوری بھی ہو سکتی ہیں جن کی پروا
ر نہ رہی ہوگی۔ مثلاً متروکات کا استعمال، عطف و اضافت میں بے احتیاطی
ہندی اور فارسی کا جوڑ، حرفوں کا گرنا یا دبنا، تکرارِ قوافی اور دوسری فنّی اُو
ی لغزشیں ــ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے
ید کے لحاظ سے ان پابندیوں میں اپنی شاعری کو جکڑنا نہیں چاہتے تھے بعض
ظ جس طرح عوام کی زبان پر جاری تھے، نظیر انھیں اسی طرح استعمال کرتے
لین بعض الفاظ کی شکل تو وہ محض اپنے شعر کی خاطر بگاڑ دیتے تھے جیسے کبھی کبھی مصرعہ
ج یا ترنّم سنبھال لیتا تھا ورنہ اس غلطی کو غلطی کے سوا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

نظیر تھوڑی بہت پنجابی، برج بھاشا اور پوربی بھی جانتے تھے اور بعض نظموں میں
ں نے ان سے کام بھی لیا ہے لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر وہاں کی مقامی
بھاشا کا معلوم ہوتا ہے جس نے کھڑی بولی کے ساتھ مل کر ایک خاص طرح کا
ِ پیدا کر دیا ہے۔ بعض نظموں میں تو انھوں نے اس کے استعمال کا خاص اہتمام
ہے لیکن بعض جگہ ان سے بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ وہ اگر کبھی ضرورت کے لحاظ
یر کرتے بھی تھے تو آگرہ کی بول چال کی زبان سے زیادہ دور نہیں جاتے تھے،
ا واحد مقصد عام فہم ہونا تھا، اسی لئے وہ مترنّم بحریں اور بول چال کے الفاظ بغیر
جھجک کے استعمال کرتے تھے۔ آج ہمیں اُن کے بہت سے الفاظ سمجھنے میں
ری ہوتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ہم اُس بول چال کی زبان سے پوری
اقف نہیں لیکن ایک دوسری وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اب تک نظیر کی نظموں کا کوئی
ڈیشن شائع نہیں ہوا ہے۔ اس طرح لسانی اعتبار سے بھی نظیر کا مطالعہ

بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو نظیر کی شاعری اُردو ادب کے سرما
میں نئی قدریں لے کر داخل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ان نئی قدروں کا تجزیہ
روایتی تنقید نہیں کر سکتی۔

نظیر درحقیقت ایک اہم قومی شاعر اور مبلغ انسانیت پیامبر ہیں۔ اُن کے تفکر
کا پایہ بلند نہیں، اُن کے سامنے کوئی واضح سماجی تصور نہیں، ان کی شاعری میں فنی
نقائص بھی ہیں پھر بھی وہ اپنے دور کے سب سے بڑے ترجمان کہے جا سکتے ہیں۔ ان
کلام کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ ایک تماشائی یا تخیل پرست
کا مشاہدہ نہیں بلکہ غم اور خوشی کی ان منزلوں سے گزرنے والے کا مشاہدہ ہے جو
اپنے طبقہ کے نقطۂ نظر میں محدود نہیں ہے، یہی نظیر کی بڑائی ہے۔